اردو ادب اور عورت: پس منظر و ابتدا

ڈاکٹر روش ندیم*

Abstract:

The Literary and socio-political role of woman of Indo-pak region was not very noteable espacially in the classic period of Urdu literature. But prominent Muslim leadership continued this behaviour during the Sir Sayyad Ahmed Khan's era. Atlast women came forward themselves to construct their identity and status. Their literary work shows thier abilities and struggle.

مارگن کی تحقیقات کے ضمن میں اینگلز نے عورت کی محکومیت اور پدرسری کو مذکور تینوں عناصر کے باہمی تعلق وارتقا کے ساتھ مشروط کیا ہے۔(۱) گویا قدیم اشتمالیت کے بعد کی تمام تر تہذیبی تاریخ ملکیتی نظام کی اسی جبریت کا شکار دکھائی دیتی ہے۔فیمنیت دراصل روشن خیالی کی پیدا کردہ جدیدیت کا ایک اہم رویہ ہے جسے نیولبرل اذہان نے اپنایا تھا۔ بعدازاں نیولیفٹ ،نوترقی پسند اور نو مارکسی دھڑوں نے کلاسیکی مارکسیوں کی سخت تنقید کے باوجود اسے اپنی جدوجہد کا بنیادی حصہ بنالیا تھا۔ مابعد جدیدیت ان نیولبرل اور نیولیفٹ دھاروں کی مشترکہ آواز بنی۔(۲) انقلابِ فرانس کے فوراً بعد شروع ہونے والے لبرل فیمنائی رجحان کا ہدف مرد کو ثقافتی وسماجی ماڈل قرار دیتے ہوئے مردوں سے حقوقِ نسواں کا حصول تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد اور خاص کر عالمی جنگوں کے دور میں عورت کے سماجی وتاریخی تجزیے کی بنیاد پر فیمنائی ارتقا پدرسری نظام کے مکمل خاتمے کے ارتقائی مرحلے تک آگیا۔ لینن ازم اور ماؤازم کے اضافوں کے ساتھ بھی مارکسیت عورت کے مسئلے کو تاریخی مادیت اور غیر طبقاتی سماج سے الگ کر کے دیکھنے کو تیار نہ ہوئی لیکن سرمایہ دارنہ ارتقا عورت کے مسئلے کو طبقاتی و ملکیتی جدیدیت کے دائرے میں حل کرنے کا متمنی رہا ہے۔

پاک وہند میں عورت کے حوالے سے انحراف پسند فکر کا آغاز یورپی سرمایہ داریت کے پیدا کردہ اس

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ اصغر مال کالج، راولپنڈی۔

نوآبادیاتی جدیدیت پسند شعور کا نتیجہ تھا جو تعلیمی و نصابی ذرائع سے پروان چڑھا تھا۔ سچی خیرخواہی اور ریاستی فرمانبرداری کی خصوصیت مجموعی طور پر سرسید تحریک کا بنیادی خاصہ تھی۔ اسی نوآبادیاتی خیرخواہی اور فرمانبرداری پر مشتمل ذہنی ڈھانچے نے ریاستی ترجیحات پر اپنی تشکیل کی تھی۔ جبکہ عقلیت وحقیقت کو اساس بنانے والی یہ جدیدیت ان یورپی روشن خیالوں یا خردافروزوں کی روایت نہیں تھی جو فکرونظر کی انفرادی آزادی اور تشکیک پر مبنی تھی۔ نوآبادیاتی حکمرانوں کی تعلیمی اصلاحات پر پروان چڑھنے والی اس جدیدیت کا اہم ہدف فکری وادبی اور مذہبی واخلاقی حوالے سے مقامی روایت کے رَد پر نئے مڈل کلاس مائنڈ سیٹ کی تشکیل تھا۔ سرسید تحریک کے دانشور لکھاریوں نے ہندمسلم تہذیبی احیاء کے حصول کے ضمن میں یہ دونوں کام حقیقت، تعقل اور اجتماعیت کو بنیاد بنا کر کیے۔ ہندستان کے مقابلے میں یورپ کیتہذیبی برتری کی قبولیت اور مقامی کلاسیکی ادبی فکری روایت سے برگشتگی کی بنا پر رواج دی گئی حقیقت نگاری نے جن معاملات کو ابھارا ان میں: (الف) معروضی حقائق کی قبولیت، (ب) مقامی زبانوں کے جدید ادب کے ذریعے تشکیل کردہ نئی حقیقت کی تشکیل، (ج) اس کی نچلی عوامی تہوں تک رسائی، (د) تعقل کے ذریعے مقامی علامتی، استعاراتی اور فکری نظام پر مبنی کلاسیکی ادب کا انکار اور (ہ) اجتماعیت ومقصدیت کے تحت نچلے اور صنفی طبقات سے خالی سماجی وژن کو عام کرنا شامل تھا۔ ایک خاندان کے قومی استعارے میں نئی نسل کی تربیت پر مبنی ڈپٹی نذیر کے ان تمام ناولوں نے مندرجہ بالا حوالوں سے ہندستانی نوآبادیاتی ریاست کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا(۳) جو انگریز انتظامیہ کے وژن، ان کی ترمیمات وہدایات اور انعامات وترغیبات کے زیر اثر لکھے گئے تھے۔ مقامی زبانوں، شناختوں اور سوچوں کے بٹوارے کے حوالے سے جو کام فورٹ ولیم کالج نے آغاز کیا تھا وہ سرسید تحریک تک آتے آتے زیادہ عمیق اور باریک سطح پر تشکیل پانے لگا تھا۔

یہ نوآبادیاتی تعلیمی منصوبہ ہی تھا جس نے جدیدیت کے تحت عورت کے متعلق ایک نیا نقطہ نظر ابھارا جس کا آغاز تعلیم نسواں کے قضیے سے ہوا۔ نئی اخلاقیات اور ورلڈ ویو پر مبنی عورت کا نیا تصور سرسید تحریک کے تعلیمی وادبی دونوں کے مشترکہ اہداف کا حصہ تھا۔ دلی کالج اور اپنے نو عیسائی استاد ماسٹر رام چندر سے جدیدیت کا سبق سیکھنے والے گورنمنٹ کے سچے خیرخواہ اور ریاستی فرمانبردار(۴) ڈپٹی نذیر اپنے قصہ نما ناولوں عورت کے اسی کردار وتصور کا ابلاغ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ناول طبقاتی شناختوں کو واضح اور صنفی شناختوں کے کردار وتصور کی تعمیرِ نو کرتے ہیں۔ نوآبادیاتی بددلی، بداعتمادی اور اخلاقی زوال کے احساس تلے نئی شناختوں کے یہ متلاشی نئے تعلیمی فکری تناظر کے زیر اثر اپنے کلاسیکی فکری ادب کو فحش، تعیش پسند، بیہودہ اور غیر مہذب قرار دے رہے تھے۔(۵) صنفی مسئلہ اسی فکریات کا ایک جزو تھا۔

ردِنوآبادیات کے نقطہ نظر کے متوازی نیا پاکستانی ذہن اپنے ادبی تناظر کا تجزیہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے کہ

ہند مسلم ثقافت کی مہذب طوائفوں اور زنان خانوں میں بند گھریلو عورتوں پر قائم پدر سری کا نمائندہ اردو ادب عورت کی حقیقی شکل اور حالت دکھانے سے قاصر تھا مثلاً مذکر صیغے کی حامل غزل بازاری عورت نما محبوب پر، مثنوی پریوں، ملکاؤں، شہزادیوں، طوائفوں اور خدمت گار عورتوں پر، ریختی شہوت زدہ عورت اور غیر نسائی ذہن کی مصنوعی زبان پر، واسوخت طوائف نما عورت پر اور داستان عورتوں کے حسن و عشق، چالاکی اور مہم جوئی پر مشتمل تھی، گویا سب کا سب اردو ادب ایک غیر حقیقی عورت کو ہی پیش کر رہا تھا،(٦) کیونکہ اس کے حقیقی پس منظر میں عورت اچھوتوں کی وہ نسوانی قسم سمجھی جاتی تھی جو جنس، پیدائشِ اولاد اور کھانا پکانے کی وجہ سے خاندان میں ایک حد تک قبول کر لی گئی تھی۔ پھر وہ زبان جس میں یہ ادب لکھا جا رہا تھا وہ بھی ''مردوں کے حق میں جانبدار تھی۔''(٧) جبکہ ایک طرف خود عورتوں کی اپنی زبان کمتر اور غیر ادبی تصور ہوتی تھی اور دوسری طرف شعر و ادب کی تعلیم بھی ان کے لیے نا قابلِ قبول تھی۔ لہٰذا اگر کسی عورت نے کچھ لکھنے کی کوشش کی تو اسے مردانہ نام اور مردانہ لہجہ اپنانا پڑا۔(٨) اسی لیے تو میر حسن کے تذکرے میں شامل ٢٩٢ شعراء میں صرف ایک شاعرہ کا اور مصحفی کے تذکرے میں شامل ١٩١ شعراء میں صرف پانچ شاعرات کا ذکر ملتا ہے جبکہ اس کے برعکس سعادت یار خان کے دواوین میں محض طوائفوں اور کسبیوں کی تعداد ١٣٩ ہے۔(٩) نئے شعور کے مطابق اس وقت آبرو، ناجی، زٹلی، انشاء، رنگین، شوق اور جرأت جیسے شعراء مسلم طبقۂ امراء کے عیش پسند مزاج کی تسکین کے لیے ''عورت کی شہوت انگیز تصویر کشی'' میں مصروف تھے اور فورٹ ولیم کی قدیم قصوں پر مشتمل جدید نثری کتابوں مثلاً باغ و بہار، فسانۂ عجائب، بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ وغیرہ میں بھی عورت کی کچھ ایسی ہی پیشکش ہو رہی تھی۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کاوشوں کے باوجود اشرافیہ کے مسلم زنان خانوں تک محدود عورتوں پر تعلیمی پابندیاں عام تھیں۔ دراصل راجہ رام موہن رائے کا بنگال یورپی اقوام کی اولین آماجگاہ ہونے کے باعث نو آبادیاتی جدیدیت کی طرف بہت پہلے بڑھ چکا تھا جبکہ باقی ہندستان بھی ایسے ہی تغیرات کی زد میں تھا۔ ایسے میں دو طرح کی تبدیلیاں ہندستانی عورت کے لیے نئے آفاق روشن کر رہی تھیں: اول۔ یورپی مشنری و فلاحی اداروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ستی، بیوہ اور بچپن کی شادیوں بارے آئینی اقدامات اور دوم: پرائیویٹ تعلیم کے لیے آتو جی نامی انگریز گورنس استانیوں کا تعین۔ خاص کر ١٨٥٧ء سے نو آبادیاتی حکومت عورتوں کے پردہ سکولوں، فائن آرٹ اور فزیکل ایجوکیشن کے علاوہ انڈسٹریل ہوم اور ووکیشنل سکول قائم کر کے فیس معافی، وظائف، معلّمی کی تربیت اور روزگار کے لیے اقدامات کر رہی تھی جس سے ایک 'جدید عورت دوست' ماحول ترتیب پانے لگا تھا۔ نو آبادیات کے ابتدائی پچاس پچپن سالوں میں عورتوں کے لیے سکولوں کے وسیع جال کے علاوہ چودہ پندرہ کالج اور پرائیویٹ امتحان کی سہولت کی حامل ایک یونیورسٹی بھی قائم کر دی گئی تھی۔ ١٨٨٤ء میں مشتریوں کے عورتوں کے لیے پہلے رسالے ''رفیق نسواں'' کے بعد سعید احمد دہلوی کا ''اخبار

النساء'' اور مولوی مختار علی کا ''تہذیب النساء'' آنے لگے۔ ۱۸۷۴ء میں سعید احمد دہلوی نے عورتوں کے لیے ''ہادی النساء'' اور ۱۸۷۷ میں ''تحریر النساء'' تحریر کیں۔ اسی عرصے میں پاک وہند کی قدیم مگر مردانہ اردو شعری روایت میں عورت اور اس کے حوالے سے سماج کی بدلتی صورت حال کو ادبی اعداد و شمار کے ضمن میں دیکھا جاسکتا ہے۔ شاعرات کے حوالے سے بطور اولین ریکارڈ (۱۷۹۴ء) ''تذکرہ ہندی گویاں'' کا ضمیمہ اس حوالے اہم ہے۔ گو اس میں مصحفی نے محض پانچ شاعرات کا ذکر ہے لیکن بعد ازاں کریم الدین کے ''گلدستۂ ناز نیناں'' (۱۸۴۵ء) میں کچھ مزید جبکہ عبدالغفور نساخ کے ''سخنِ شعراء'' (۱۸۷۴ء) میں ۳۹ شاعرات کا ذکر ملنے لگا۔ اردو شاعرات پر مشتمل پہلا تذکرہ بنام ''بہارستانِ ناز'' از فصیح الدین رنج ۱۸۶۴ء سے ۱۸۸۲ء تک تین بار چھپا جس میں دوسری اشاعت میں موجود ۷۰ شاعرات کی تعداد اس کی تیسری اشاعت تک ۱۷۴ ہوگئی تھی، جن میں ۱۲۸ شاعرات کا اردو کلام شامل ہے۔ بعد ازاں درگاہ پرشاد نادر کا ''تذکرۃ النساء نادر'' (۱۸۷۸ء) کے حصہ ''چمن انداز'' میں ۱۴۴ اور عبدالحیٔ صفاء بدایوانی کے تذکرہ ''شمیمِ سخن'' حصہ دوم (۱۸۸۲ء) میں ۱۵۱ شاعرات کا ذکر ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مردانہ غزلیہ روایت کے باعث ''سبھی شاعرات نے اپنے لیے مذکر افعال استعمال کیے اور اپنے عورت ہونے کو ظاہر نہیں کیا۔'' لیکن پھر بھی نسائی لہجہ کسی نہ کسی انداز میں ابھرتا محسوس ہوجاتا ہے بعض کے ہاں مونث افعال اور صیغوں کا استعمال تو ہے مگر زیادہ تر نعتوں اور نظموں میں۔ (۱۰) قابلِ محسوس بات یہ ہے کہ عورتوں کی ان شعری تخلیقات میں سماجی تضادات اور عورتوں کے شعور و مسائل وغیرہ کی طرف کوئی اہم پیش رفت نظر نہیں آتی۔ یہی صورتحال اردو کی پہلی اور دوسری صاحبانِ دیوان شاعرات امتیاز (۱۷۹۷ء) اور مہ لقا چندا (۱۷۹۸ء) کے علاوہ ۱۹ویں صدی کی نصف آخر کی شاعرات اثیمہ، حجاب، پروین، جمیلہ، شرم، شیریں، صدر اور عالم کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ فنی پختگی اور شعری کثیر صنفی کے ساتھ ساتھ نسائی جذبات، لب ولہجہ اور ثانیت کا استعمال تو مل جاتا ہے لیکن نئے شعور کی لہریں اور بیداریِ نسواں کے عناصر ناپید محسوس ہوتے ہیں۔

شمالی ہند کے سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے جدید فکر کو ۱۹ویں صدی کے دوسرے نصف میں بنگالیوں کی نشاۃِ ثانیہ کے تقریباً پچاس سال بعد پھیلایا تھا۔ نو آبادیاتی جدیدیت کی پیدا کردہ یہ ملازمت پیشہ غیر سیاسی مڈل کلاس تحریک عقلیت پسندی اور روشن خیالی کی داعی تھی لیکن نئی اخلاقیات اور سماجی وادبی تصورات کی بانی ونمائندہ ہونے کے باوجود عورت کے مسئلے پر یہ رجعت پسندانہ نقطۂ نظر کی ہی حامل رہی۔ اسی لیے ان کے ہاں ایک مقدس مگر فرضی، غیر واقعی اور بنیادی طور پر استحصالی اخلاقی وسماجی تصور وضع ہوا۔ (۱۱) اس مڈل کلاس اخلاقیات میں عشق کا تصور خطرناک اور جنس ایک کریہہ گناہ کی علامت قرار دیا گیا جس کے ''منبع'' یعنی عورت کو بطور صنف اچھوت کا درجہ دے کر محض زندگی کا ایک کارآمد و خاموش کل پرزہ سمجھا جانے لگا۔ یوں سرسیدین نے قومی مقصدیت کی اساس کلاسیکی

فکری ادب کے برعکس جو نیا ادبی ماڈل تشکیل دیا وہ ایک طرح سے شریف لوگوں کا نیک، مہذب، غیر فحش اور غیر تعیش پسند ادب تھا جس میں اب روایتی محبوب کی جگہ ایک گرہستن کا کردار آ گیا تھا جو روایتی جنسیاتی خصوصیات سے خالی ایک گھریلو، مظلوم اور نامکمل سماجی پیکر تھا جو ایک فرد تو تھا مگر عورت نہیں تھی۔ عورت کی یہ غیر جنسی (Asexual) حیثیت درحقیقت عورت کی صنفی بنیاد، اس کے جنسی جوہر بلکہ عشق کی صحتمند بنیاد ہی کا خاتمہ تھا۔ ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلاسیکی غزل، مثنوی اور داستان کی طرح جدید شعور کے حامل ادیبوں نے بھی عورت کو ادھورا اور نئی مردانہ خواہشات و ترجیحات کے ساتھ ہی کیوں پیش کیا؟ آزاد کی رومانیت، حالی کی بیوہ، نذیر کی اکبری و اصغری اور شبلی کی مقدس مردانہ تاریخ میں عورتیں کہاں اور کیسی ہیں؟

۱۸۶۹ء میں مولانا حالی کی ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''مجالس النساء'' کی طرح انعام یافتہ ڈپٹی نذیر احمد کا 'مرۃ العروس' بھی جدید ادب کے اولین شاہکار کے طور پر سامنے آیا جس میں رائج ثقافتی حدود میں رہ کر عورت کے مسائل کے حوالے سے نیا نقطۂ نظر اپنایا گیا تھا۔ انہوں نے عورت کے حوالے سے تعلیم، تربیت، بیوگی، طوائفیت اور مرد کی دوسری شادی کے مسائل کو اپنی تحریوں کا حصہ بنایا۔ حالی کی ''چپ کی داد' رفقائے سرسید میں عورتوں کے حوالے سے زیادہ ہمدردانہ زاویہ نظر تھا۔ جدید نقطہ نظر کے حامل الطاف حسین حالی عورت کی کم لباسی سے خائف لیکن اس کی برابری، تعلیم اور ٹھیک عمر اور مرضی سے شادی کے قائل تھے۔ جن دنوں سرسید، اکبر اور ان کے کانگریسی دوست بدرالدین طیب جی کے بیٹے بیٹیاں تعلیم کے لیے مغربی ملکوں کا رخ کر رہے تھے عین اس وقت سرسید اس نقطۂ نظر کے حامل تھے کہ:

> ''میری یہ خواہش نہیں کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جا رہی ہیں...... ممکن ہے (یورپ میں) عورتیں پوسٹ ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکتی، لیکن ہندوستان میں نہ اب وہ زمانہ ہے اور نہ سینکڑوں برس میں آنے والا ہے...... (تم صرف) گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو۔'' **(۱۲)**

حالانکہ سرسید ان نامبارک کتابوں کو (شاید صرف مردانہ) مسلم احیاء کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس صنفی امتیاز کے پیشِ نظر انہوں نے عورتوں کے حوالے سے لکھی گئی امتیاز علی تاج کے والد کی کتاب کا مسودہ ہی پھاڑ دیا تھا، جن کی بیوی محمدی بیگم لاہور سے ۱۸۹۸ء میں مشہور رسالہ 'تہذیب نسواں' کا آغاز کرنے والی تھیں۔ اسی طرح سرسید کا نیچری کہہ کر مذاق اڑانے لیکن اپنے بیٹے کو برطانیہ بھجوانے والے اکبر الہ آبادی بھی اپنی شاعری میں تعلیمِ نسواں پر شدید طنز کرتے ہیں کہ انگریزی تعلیم انہیں بے شرم اور آزاد کر دے گی۔ جب انیسویں صدی میں مسلم خواتین ہندستان کی دیگر عورتوں کے مقابل کھڑی ہو کر تعلیمی میدان میں شانہ بشانہ چل سکتی تھیں، اکبر نے تعلیم نسواں کی مخالفت سے قوم کو گمراہ کیا اور

تعلیم یافتہ خواتین کی کچھ ایسی تصویر کشی کی جس سے لڑکیوں کے لئے تعلیم مشکل تر ہو گئی۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن، پہلے چراغ خانہ تھی
میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ
علمی مباحثے ہوں، ذرا پاس آکے لیٹ (۱۳)

بقول بیگم خواجہ حسن نظامی اکبر صرف اس بات کے حامی تھے کہ ''عورتوں کو وہی تعلیم حاصل کرنا چاہیے جو امور خانہ داری، بچوں کی تربیت اور شوہر کی رفاقت میں معاون ثابت ہو''۔(۱۴)

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مسئلہ محض تعلیم نسواں کا نہ تھا بلکہ محکوم و مجبور عورت کے روایتی تصور کے حامی اکبر کے ہاں عورت بحیثیت صنف مجموعی طور پر قابل عزت واحترام نہ تھی۔ اسی لیے تو وہ اپنی مقامی یا مسلم عورتوں کے برعکس مغربی عورت کا ذکر نہایت کمتر انداز میں کرتے ہیں:

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پری زاد ہوں اور کس نہ لیا جائے
رات مس سے کلیسا میں ہوا جو دوچار
ہائے وہ حسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ ابھار
لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز وطریق
ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش (۱۵)

ممکن ہے سر سید احمد خان کے تعلیم نسواں کے متعلق رویے کے پیچھے خود اکبر کا ردعمل کا حامل رویہ ہی ہو۔ گو سر سید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر دی تھی۔ لیکن اس کی کوئی شق تعلیم نسواں کے منصوبے کی طرف اشارہ نہ کرتی تھی۔ جب سید محمود لندن سے واپس آئے تو انہوں نے ۱۸۹۲ء کی ایک تعلیمی کانفرنس میں مسلم عورتوں کے لئے جدید تعلیم، علاحدہ سکول اور نصاب پر زور دیا مگر سر سید نے کہہ دیا کہ: ''عورتوں کی تعلیم کے لئے مدرسوں کا قائم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا ہندوستان کی موجودہ حالت کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہیں اور میں اس کا سخت مخالف ہوں''۔(۱۶) ۱۸۹۹ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ کے اجلاس میں جا کر کہیں جسٹس سید امیر علی نے خطاب میں کہا کہ: ''میری رائے میں لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں کے متوازی چلنی چاہیے تا کہ سوسائٹی پر اس کا سودمند

اثر پڑے۔ جب تک ترقی کے دونوں جزو برابر تناسب سے نہ ہوں گے کوئی عمدہ نتیجہ نہیں ہوسکتا۔"(۱۷) سرسید کے نقطۂ نظر کا بعدازاں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جدید اردو ادب کی مقصدیت پسند اور سماجی وقومی اصلاح کی بنیاد کے نتیجے میں "عورت کے حوالے سے بیوگی، گھریلو ناانصافی اور تعددِ ازواج کے مسائل کی شکار عورتیں فکشن میں مرکزی اہمیت اختیار کر گئیں۔"(۱۸)

انیسویں صدی کے نصف دوم میں نوآبادیاتی جدیدیت، اس کے تحت تعلیمی اصلاحات اور دیگر سماجی سیاسی تشکیلات کے باعث ابھرنے والی اصلاحِ نسواں ابتداً عورتوں کے حوالے سے مردوں کے نقطۂ نظر میں ابتدائی تبدیلیوں کا جواز بنیں۔ لیکن یہی دور ہے جب عورتوں نے بھی اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے قلم تو تھام لیا تھا مگر نئی پدرسری اخلاقیات کا شدید دباؤ بھی انہیں سہنا پڑا۔ اس کی اولین مثال پہلی اردو ناول نگار رشیدالنساء ہے جو شمس العلما وحید الدین خان بہادر کی بیٹی، شمس العلما امداد امام اثر کی بہن، انگریزی قانون دان سر علی امام کی پھوپھی، بیرسٹر محمد سلیمان کی والدہ، لیڈی سر عبدالرحیم اور بہار کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ نثار کبریٰ کی والدہ تھیں۔ ایسے جدید تعلیم یافتہ خاندان کی ایک باصلاحیت خاتون کا ۱۸۸۱ء میں لکھا جانے والا ناول "اصلاح النساء" تیرہ سال تک چھپنے نہیں دیا گیا کہ شرفاء کی خواتین کے نام کا شہرت پانا ناپسندیدہ عمل ہے۔ جب ان کے صاحبزادے محمد سلیمان انگلینڈ سے پڑھ کر آئے تو انہیں مسودے کا خیال آیا۔ یاد رہے کہ صوبہ بہار میں لکھے گئے اس ناول پر ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ساتھ بنگالی ناولوں کا بھی اثر ہے۔ بہار اور کلکتہ کے درمیان ریلوے پل کی تعمیر سے بنگالی جدیدیت کے اثرات وسطی ہند میں شدید ہو گئے تھے۔ بقول رشیدالنساء:

> اللہ مولوی نذیر کو عاقبت میں بڑا انعام دے، ان کی کتاب (مراۃ العروس) پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جہاں تک ان کو معلوم تھا انہوں نے لکھا اور اب جو ہم چاہتے ہیں اس کو انشاءاللہ تعالیٰ لکھیں گے جب اس کتاب کو لڑکیاں پڑھیں گی تو مجھے خدا سے امید ہے کہ انشاءاللہ سب اصغری ہو جائیں گی۔ شاید سو میں سے ایک اپنی بدقسمتی سے اکبری رہ جائے تو رہ جائے۔ میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کو پڑھنے سے عورتوں پر زیادہ اثر ہوگا اور وہ سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کی جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات ہے۔(۱۹)

۱۸۹۴ء میں طبع ہونے والے اس ناول میں ڈپٹی نذیر احمد کے مرۃ العروس کو ماڈل بنانا اور ایک عورت کا خود آگے بڑھ کر عورتوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھانا اہم ہے۔ "رشیدالنسا کی مجبوری یہ ہے کہ ان کی تعلیم گھریلو ہے۔ مخصوص سخت گیر مسلم معاشرت کا گھیرا ان کے گرد تنگ ہے۔ پھر ناول نگاری کا فن بھی الف بے کے مرحلے میں ہے۔ فنی اعتبار سے ناول لکھنے کی سعی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہے۔"(۲۰) اس ناول میں ایک

عورت نے تو اہمات کے ساتھ ساتھ ایک مرد کی دو بیویوں کو بطور کردار لے کر دراصل نسوانی مسائل کو اٹھایا ہے۔ لیکن اس میں قابلِ توجہ کرداروں کا اسمِ بامسمّی کی بجائے نیکی و بدی کا مجموعہ دکھانا اور روشن خیالی وقدامت کی کشمکش اور تعلیم کی اہمیت ہے۔ اردو کی اس پہلی ناول نگار رشید النساء کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں عورتوں کے لکھے ادب کے بنیادی ماحول اور نقطۂ نظر کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

ہندستان کی سماجی سیاسی صورت حال کے باعث نوآبادیاتی عہد میں اردو ادب میں باضابطہ طور پر فیمنائی تحریک تو ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن عورت کے جدید تصور کی تشکیل کرنے کے بعد اسے جدید زاویہ نظر کے تحت ہمدردانہ طور پر دیکھا جانے لگا تھا۔ ۲۰ویں صدی کے آغاز تک پھیلا ہوا اصلاحِ نسواں کا یہ زمانہ عورتوں کے حوالے سے مردوں کے نقطۂ نظر میں ابتدائی تبدیلی سے مزین ہے۔ اصلاحِ نسواں نوآبادیاتی پدرسری کے تحت نئی مردانہ سوچ کی حامل اصلاح تھی جس کا آغاز اردو ادب میں نئی سوچ کے نمائندے مولوی نذیر احمد نے کیا تھا اور اسے اس دور کی خواتین لکھاریوں نے قبول بھی کیا تھا۔ اصلاحِ نسواں کا رجحان مراعات یافتہ وخوشحال طبقوں میں مقبول ہوا تھا۔ نیا شعور ہندو طبقۂ امراء میں خاندان اور معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے یہ سوچ مستحکم کر رہا تھا کہ ''درمیانے طبقے میں خاندان کا ادارہ ان رسوم کی وجہ سے خطرے سے دوچار ہے اور بے سہارا بیواؤں کی ایک بڑی تعداد قحبہ خانوں کو آباد کر رہی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ خاندان کے ادارے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان قوانین کو بدلا جائے۔''(۲۱) اسی طرح کثیر زوجگی، ستی، بیوہ اور بچپن کی شادی اور تعلیم وجائیداد سے محرومی وغیرہ کے خلاف حکومت اور مشنریوں کے اصلاحی اقدامات کی قبولیت اصلاحِ نسواں کے رجحان کو پروان چڑھا رہی تھی۔

سرسید تحریک کے انجام پر ۲۰ویں صدی کے شروع میں یورپ کے صنعتی انقلاب نے ہندوستانی نوآبادی میں بھی تغیرات کے سلسلے کو تیز تر کر دیا تھا۔ نئے حالات کی ترجمان اب یورپ اور یورپی تعلیم سے براہِ راست استفادہ کرنے والی نئی ہندستانی نسل تھی۔ عالمی سطح پر صنعتی واشترا کی انقلابات، عالمی جنگیں، نئے افکار ونظریات اور فیمنائی تحریکوں کے اگلے ترقی یافتہ فکری وعملی مراحل کے ساتھ ساتھ ملکی سطح غدر تحریک، کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام، کانگریس کی تحریک آزادی اور ہندوستانی پرولتاریہ کے قیام نے حالات کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہندو خواتین کانگریس (۱۹۰۸ء) اور بھارت ستری مہامنڈل (۱۹۱۰ء) وغیرہ کا قیام، منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۱۹ء) اور مانٹیگو چمیسفورڈ اصطلاحات (۱۹۲۰ء) کے تحت عورتوں کی تعلیم اور ووٹ کے ساتھ ساتھ وارثت، ملازمت، سیاست، خلع وغیرہ جیسے ریاستی، آئینی اور اصلاحی اقدامات سماج کا نقشہ بدل رہے تھے۔ شیخ عبداللہ کے رسالے ''خاتون'' (۱۹۰۴ء) اور عورتوں کے لیے ان کی تعلیمی کاوشیں وغیرہ اسی ماحول کا نتیجہ تھا۔ ان سب کے اثرات ادب وفکر کے ساتھ ساتھ تصورِ عورت پر بھی پڑنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں راشد الخیری کے رسالہ

''عصمت'' کے بعد خواتین اردو ادیبوں کی ایک واضح روایت تشکیل پانے لگی۔ انہیں سماجی سیاسی تبدیلیوں کے زیرِ اثر نئی نسل کے آتے آتے اصلاحِ نسواں کا فکری رجحان حقوقِ نسواں کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ یہ روشن خیالی کا لبرل رویہ تھا جو جدید مغربی اقدار کے تحت نو آبادیاتی ثمرات سے مستفید ہونے والے طبقات کے لیے کشش کا باعث تھا۔ لہٰذا ان طبقات کا ماڈل پردے کی روایت توڑ کر مرد کے شانہ بشانہ تعلیم حاصل کرنے والی کھلے ذہن کی عورت بنی۔ یہ رجحان بھی نئے حالات میں مردانہ طلب ہی تھا جسے عورت نے اپنے لیے آزادی کا پیام تصور کیا۔ مگر خود اس کے اپنے ہاں پدرسری مخالف فیمنائی شعور کی اولین لہر بھی نئی نسل کے ہاتھوں تشکیل پانے کو تھی۔

۲۰ ویں صدی کے آغاز میں نئی نسل کے نوجوان نئے تصورات و نظریات سے لیس تھے۔ اس عہد کے اہم ترین نوجوان مفکر اقبال دورہ انگلستان سے قبل ''مخزن'' میں حقوقِ نسواں کو ایک مسئلہ قرار دیتے ہوئے پردہ، تعلیم، تعددِ ازدواج وغیرہ پر غور کر رہے تھے۔ عورتوں کو 'اسلام کی مقررہ حدود کے اندر مقید' رکھنے والی فکری تبدیلی ان کے ہاں بعد میں سامنے آئی تھی۔ (۲۲) گو اسی طرح جوش جیسے شاعرِ انقلاب کا فکری انحراف نئے حالات کا معاون لیکن وہ اپنی تمام تر انقلابی روشن خیالی کے باوجود عورت کو اس کا حصہ نہ بنا سکے۔ بقول علی سردار جعفری وہ ''علم کو عورت کے حسن کی موت اور صرف ایک رنگین کھلونا سمجھتا ہے۔'' (۲۳) اسی دور میں سرشار نے تعلیمِ نسواں، بیوہ اور کم عمر لڑکیوں کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ جبکہ شرر پردے کی سخت گیری کے مخالف، تعلیم نسواں کے حامی اور بیوہ کے مسائل پر پریشان تھے۔ اسی لیے جب فرنگی محل علماء انگریزی خواندہ لڑکی سے شادی کو ناجائز قرار دے رہے تھے تو انہی دنوں وہ اپنے ناول 'بدرالنساء کی مصیبت' میں نئی سوچ کے حامل کرداروں کو انتہائی جرأت مند اور فعال روپ میں پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے ''بدرالنسا'' کے دیباچے میں عورت کے بازاری جنس (کموڈیٹی) ہونے کے تصور پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ ''عورت ہے تو بڑی قابل قدر چیز مگر اس کا شمار غیر ذی روح اشیا میں ہوتا ہے۔'' (۲۴) منشی سجاد حسین کا 'احمق الذی' بھی اس حوالے سے قابلِ غور ہے۔ راشد الخیری نے بھی ان حوالوں کے علاوہ مظلوم و بے بس عورتوں کو موضوع بنا کر اور عورت کی اپنی مرضی کی شادی کی حمایت کر کے اپنا حصہ ڈالا تھا۔ البتہ ان سب میں رسوا وہ لکھاری تھے جن کے ناول 'امراؤ جان ادا' کو پہلا فیمنائی متن کہا گیا۔ انہوں نے اپنے ناول 'شریف زادہ' میں پردے و برقعے کی بحث اٹھائی اور 'اختری بیگم' میں عورتوں کو کہا کہ ''پاؤں توڑ کے گھروں میں بیٹھنا کوئی اچھا دستور نہیں ہے''۔ انہوں نے عورت کے حوالے سے پردہ، طوائف اور ملازمت کو بھی اپنے موضوعات کا حصہ بنایا۔ (۲۵)

مرد لکھاریوں کے متوازی خاتون مصنفین بدلتے شعور کی جھلکیاں لیے اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر، صغریٰ ہمایوں، حجاب امتیاز علی، فاطمہ بیگم، طیبہ بیگم، محمدی بیگم، بیگم اختر سہروردی، شائستہ اکرام اللہ، اظ حسن، نزہت، حجاب کے علاوہ زخ ش (زاہد خاتون شیروانیہ)، صفیہ شمیم ملیح آبادی، رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال جیسی تخلیق کار سامنے

آ ئیں۔ان میں سے۱۹۲۳ء میں وفات پانے والی جواں مرگ 'ز خ ش' عورت پر ترقی کی راہیں بند کرنے کی شدید مخالف تھی۔ وہ اپنے والد کی انگریز پرستی اور دیگر سختیوں کے باعث شدید مشکلات کا شکار رہی مگر بار بار نام بدلنے کے باوجود اپنے خیالات اور صلاحیتوں کی وجہ سے مقبول ہوئیں۔☆(۲۶) اکبری بیگم نے فرضی مردانہ نام اور بعد ازاں والدہ افضال علی کے نام سے کئی ناول لکھے۔لیکن ''گودڑ کا لال'' (۱۹۰۷ء) کو بہت مقبولیت ملی جو عورتوں کی تعلیم، پردہ اور دیگر بے جا پابندیوں کے خلاف ایک اہم تحریر کے طور پر سامنے آیا جس میں تعلیم نہ ہونے کے باعث عورتوں کے پیچھے رہ جانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس کا مرکزی کردار مسلم طبقہ کی ترقی پسند ذہنیت اور مضبوطی و استقلال کی حامل شریف لڑکی کا ماڈل ہے۔ بقول قرۃ العین حیدر ''بہت جلد اس نے نئی مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کر لی''۔(۲۷) کئی انجمنوں کی رکن، خواتین کے رسائل کی مدیر اور ایک سکول کی بانی ہونے کے ساتھ ساتھ ادب میں ناول، سفرنامہ اور شاعری کے علاوہ موسیقیات کے حوالے سے شناخت بنانے والی صغریٰ ہمایوں (پ: ۱۸۸۴ء) نے پردہ، شادی میں عورت کی مرضی، مرد کی دوسری شادی، بیوہ کی شادی، تعلیم اور دیگر مسائل کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کا ایک اہم اصلاحی ناول ''سرگزشتِ حاجرہ'' خواتین کی تربیت اور کامیاب ازدواجی زندگی کے اصول زیرِ بحث لاتا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مرد ہم کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ ہمارے سبب سے ان کی عزت ہے، ہمارے سبب سے ان کی آبرو ہے، ہمارے سبب سے ان کا وجود ہے۔''(۲۸) سجاد حیدر یلدرم کی بیوی اور قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ رسائل کی ادارت بھی کرتی رہیں۔انہوں نے آہِ مظلوماں، حرماں نصیب اور نجمہ جیسے ناول لکھے۔ قرۃ العین نے ''(۲۹) اختر النساء بیگم'' نامی ناول کو ترقی پسند اصلاحی ناول قرار دیا جس میں بقول مصنفہ مرضی کی شادی، دوسری شادی، سوتیلی ماں، جہالت، بیوگی، تسلیم، اطاعت، جبر جیسے متعلقہ مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس کے نسوانی کردار پردے کے مخالف اور موسیقی و تھیٹر کے دلدادہ ہیں۔ان کی تحریریں ہندستان کے بدلتے ہوئے سماج کا منظر نامہ ہیں۔(۳۰) ان کے ناول کے ایک کردار اختر النساء کے حوالے سے یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''نذیر احمد اور راشد الخیری کی کوئی ہیروئن اس قدر جرأت کے کام نہیں لے سکتی تھی۔ یہ مغربی تہذیب کی بعض باتوں کو اپنانے کا جذبہ ہی تھا جو عورتوں کی آزادی اور ان کو سماجی مساوات دینے کے مطالبے کی صورت میں ظاہر ہوا۔مغربی تہذیب کے ساتھ مشرقی قدروں اور خاص طور پر مذہب پر کاربند رہنے کا جذبہ ہی پوری شدت کے ساتھ ان ناولوں میں ملتا ہے۔''(۳۱)

حجاب امتیاز علی ہندستان کی پہلی مسلم خاتون پائلٹ اور رومانوی ادیبہ تھیں۔ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے خواتین کے لیے اصلاحی ناول اور افسانے لکھنے کی بجائے ''عشق و محبت، عالمی امن اور نفسیات'' کو اپنا

موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں کا ''نوجوان طبقہ نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتا ہے۔'' کردار تعلیم یافتہ سماجی ناول، نسائی حسیت کے براہِ راست اظہار کی جگہ مصنفہ اپنی جدید حسیت کا اظہار کرتی ہے جو کہ عورت کے بدلتے ہوئے شعور کا نمائندہ ہے۔ (۳۲) ان کے نسوانی کردار ڈاکٹر اور مصور ہیں۔ حجاب اپنے ناول ''پاگل خانہ'' کے ایک کردار کے ذریعے کہتی ہے کہ قانون مردانہ سوچ نے بنایا ہے، اسے ازسرنو بدلنا چاہیے۔ ''اگر مرد عاقل اور معتبر نہیں ہے تو اسے باورچی خانے میں برتن دھونے چاہیے اگر عورت عاقل اور معتبر ہے تو اسے حکومت کے بلند مرتبوں پر فائز ہونا چاہیے۔'' (۳۳) دیگر خواتین ناول نگاروں میں طیبہ بیگم اپنے ناول ''انوری بیگم'' میں دیگر معاملات میں مشرقی وفا شعاری کی حامی ہونے کے باوجود تعلیم کے حق میں ہے۔ اسی طرح شریف بیٹی اور بہو بیٹی نامی ناولوں کی مصنفہ محمدی بیگم کے ہاں بغاوت و انحراف تو نہیں لیکن مخصوص اسلامی و اخلاقی رجحانات کے تحت عورت کے متعلق ایک مہذب و شائستہ رویہ بہت واضح ہے۔ انہوں نے کم سنی کی شادی اور شوہر کی زیادتیوں کو بطور خاص ہدف تنقید بنایا۔ اظ حسن اپنے ناول ''روشنک بیگم'' میں پسند کی شادی کا مسئلے کو زیر بحث لاتی ہیں۔ زخ ش کے ہاں سیاسی، سماجی، قومی، آزادی پسند محنت کش طبقے کے علاوہ آزادیِ نسواں کی حامل نظموں نے عورت کے بدلتے ہوئے سماجی سیاسی شعور کی نشاندہی کی۔ (۳۴) رفعیہ سلطانہ خواتین کے ابتدائی ناولوں کے متعلق کہتی ہیں کہ ''یہ ناول خواتین کی گھریلو زندگی اور سماجی رجحانات کے اچھے عکاس تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا ماحول ہوٹلوں، بازاروں اور عشق و عاشقی کے بکھیڑوں کا نہیں ہوسکتا تھا۔'' (۳۵) اسی لیے وہ محدود اور عمومی گھریلو زندگی کے ذاتی تجربے کو بیان کرتے ہوئے روزمرہ چیزوں اور باتوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتی ہیں۔ گو کم سہی لیکن ان کے ناولوں میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ان کی آرزوئیں ان کے قدم آگے بڑھاتی محسوس ہوتی ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں اصلاحِ نسواں کی کاوشوں کے نتائج واضح طور پر سامنے۔ عطیہ فیضی، ان کی بہن زہرہ بیگم، سیکریٹری مسلم لیڈیز کانفرنس نفیس دلہن، بیگم شیخ عبداللہ، بیگم بھوپال سلطانہ جہاں، بیگم ممتاز علی، بہو مولوی ذکاءاللہ سلطانہ بیگم، گیتی آرا، سروجنی نائیڈو، بیگم عباس طیب جی، خجستہ بیگم سہروردی، بیگم حسرت موہانی، بی اماں والدہ علی برادران، سعادت بانو کچلو، بیگم محمد علی جوہر امجدی بیگم، بیگم ابوالکلام آزاد، زلیخا بیگم، بہن مولانا آزاد آبرو بیگم جیسی خواتین سیاست سمیت کئی سماجی شعبوں میں فعال ہوئیں۔ ادبی و صحافتی سطح پر رشیدۃ النساء کے بعد اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، الف ص حسین بیگم، فاطمہ بیگم، صغری بیگم ہمایوں، مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی، مسز ڈی برکت، عباسی بیگم، ظفر جہاں بیگم، طیبہ بیگم، ب سدید، بلقیس جمال، منجھو بیگم، خدیجہ بیگم، رابعہ پنہاں، قمر زمانی بیگم خورشید آراء وغیرہ ترقی پسند تحریک سے قبل ہی پردے کی روایتی پابندیوں سے انکار کرتے ہوئے عورتوں کی تعلیم، اصلاح اور حقوق کے لیے آگے بڑھیں۔ ان خواتین نے مردانہ روایتی و اخلاقی بندشوں اور اقدار کو رد کر کے نئی

ہندستانی عورت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ جس کی بنیاد پر ترقی پسند ذہن کی نئی عورت جدید اقدار واخلاقیات کی تشکیل کرتے ہوئے نئے حالات میں ایک نئے روپ میں ابھری۔ ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، ادا جعفری، ممتاز شیریں، بیگم شائستہ اکرام اللہ اور قرۃ العین حیدر حقوق نسواں کی اسی نئی روایت کی نمائندہ تھیں۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ناموں پر مکمل ہوتی خواتین کی فہرست لکھاریوں کے اس شعور کا اشارہ تھی کہ مردانہ لکھاریوں کی اصلاحِ نسواں میں چھپی مردانہ انا وحاکمیت ان کے سامنے آشکار ہوگئی تھی۔ اصلاحِ نسواں کے رجحان کو انھوں نے اسی لیے حقوقِ نسواں میں بدل کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اب وہ تعلیم اور سماجی فکر وعمل کے ذریعے سابقہ محدود آزادی سے اپنے سماجی مرتبے کی امتیازی حیثیت اور اس کے حقوق و کردار کے جدید شعور سے آگاہ ہو رہی تھیں لہٰذا مرد ادیبوں کے عورتوں سے متعلقہ بیان وتصورات کو رد کرنا ضروری تھا کیونکہ پدرسری کے حامل متون میں عورت مخالف تعصب کا درآنا ناگزیر رہا ہے۔ ناول، خاکے، تنقید، ڈرامے، مضامین، سفرنامے، تراجم اور بچوں کے ادب کے علاوہ وطن پرستی، قوم وانسانیت کی خدمت واصلاح پر مبنی ناول نگاری کرنے والی صالحہ عابد حسین کے بقول ''میں چاہتی ہوں خصوصاً عورتوں کی زندگی بہتر ہو۔ ان کے حالات بہتر ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عورت ہی عورت کے مسائل پر لکھ سکتی ہے۔''**(۳۶)**

حوالہ جات

۱۔ فریڈرک اینگلس، ’’خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز‘‘، مکتبہ فکرودانش، لاہور، ۱۹۸۷ء

۲۔ روش ندیم، ڈاکٹر، ’’ترقی پسندی، لیفٹ اور ہم‘‘ مشمولہ کتابی سلسلہ ’’تناظر۔۳‘‘ گجرات، جنوری تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۴۹

۳۔ ناصر عباس نیئر، ’’اردو کی تشکیل جدید‘‘ اوکسفرڈ، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۹۲

۴۔ منذر احمد، ’’ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ان کی زبانی‘‘، مشمولہ ’’ڈپٹی نذیر احمد، حوال وآثار‘‘، مرتبہ: محمد اکرام چغتائی، پاکستان رائٹر کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۶

۵۔ ڈپٹی نذیر احمد، ’’توبۃ النصوح‘‘ مرتبہ: افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱۲ تا ۲۲۲

۶۔ روش ندیم، ڈاکٹر، ’’منٹو کی عورتیں‘‘، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۹

۷۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ’’جہات‘‘، ارتقا مطبوعات، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۹۶

۸۔ شرر، عبدالحلیم، ’’لکھنؤ‘‘، پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۲

۹۔ روش ندیم، ڈاکٹر، ’’منٹو کی عورتیں‘‘، ص ۷۱

۱۰۔ نوازش علی، ڈاکٹر، ’’خواتین کی شاعری‘‘ مشمولہ ’’پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار‘‘، مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۴۵

۱۱۔ شمس الرحمان فاروقی، ’’افسانے کی حمایت میں‘‘، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۵

۱۲۔ گجراتی، محمد امام دین، مرتب، ’’مکمل لیکچرز و اسپیچز سرسید‘‘، مصطفائی پریس، لاہور، ۱۹۰۰ء، ص ۶۸۴

۱۳۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، ’’اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ‘‘، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۴۷

۱۴۔ بحوالہ صغریٰ مہدی، ڈاکٹر، ’’اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ‘‘، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۴۷

۱۵۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، ’’اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ‘‘، ص ۳۲۳

۱۶۔ محمد امین زبیری، ’’مسلم خواتین کی تعلیم‘‘، ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۹۵۔۹۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۱۸۔ خالدہ حسین، ’’پاک و ہند ادب میں صنفیت سے متعلق موضوعات‘‘، مطبوعہ دنیازاد، کتابی سلسلہ۔۱۱، کراچی، ص ۱۶۴

۱۹۔ ادیب سہیل، ’’اردو کی پہلی خاتون ناول نگار.....رشید النسا‘‘، مشمولہ ’’اردو ناول۔ تفہیم و تنقید‘‘ مرتبہ: ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ادارہ فروغ قومی زبان، پاکستان اسلام آباد، ۲۰۱۲، ص ۱۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۱۔ تنویر انجم، ’’نسائی تحریک کا ارتقا‘‘ مشمولہ ’’خاموشی کی آواز‘‘، مرتبہ: فاطمہ حسن، آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۶

۲۲۔ قاضی جاوید، ''سرسید سے اقبال تک''، بک ٹریڈرز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۲۷۱
۲۳۔ علی سردار جعفری، ''ترقی پسند ادب''، مکتبہ پاکستان، لاہور، س ن، ص ۱۷۶
۲۴۔ بحوالہ صغریٰ صدف، ''اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت''، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دلی، ۲۰۰۲ء، ص ۸۹
۲۵۔ صغرا مہدی، ''اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت'' (اقتباسات) مشمولہ ''فیمنزم اور ہم: ادب کی گواہی''، مرتبہ: ڈاکٹر فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۵۲
۲۶۔ شاہدہ حسن، ''نسائی حسیت کا اظہار اور شعری پیرائے'' مشمولہ فیمنزم اور ہم، مرتبہ: ڈاکٹر فاطمہ حسن، ص ۱۶۲
۲۷۔ قرۃ العین حیدر، ''کارِ جہاں دراز ہے''، جلد اول، لاہور، مکتبہ اردو ادب، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۶
۲۸۔ حمیرہ سعید، ڈاکٹر، ''اردو ناولوں میں نسائی حسیت''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۶۰
۲۹۔ قرۃ العین حیدر، ''کارِ جہاں دراز ہے''، جلد اول، ص ۱۵۶
۳۰۔ حمیرہ سعید، ڈاکٹر، ''اردو ناولوں میں نسائی حسیت''، ص ۲۹، ۸۰، ۸۳
۳۱۔ یوسف سرمست بحوالہ رقیہ بانو، ڈاکٹر، ''اردو ناول میں نسوانی کرداروں کا نفسیاتی اور سماجی جائزہ''، ص ۱۶۶
۳۲۔ ایضاً، ص ۸۵، ۸۹، ۹۱
۳۳۔ حجاب امتیاز علی، ''پاگل خانہ''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۶
۳۴۔ شان الحق حقی، ''زاہدہ خاتون شیروانیہ، ز خ ش'' مشمولہ ''فیمنزم اور ہم: ادب کی گواہی''، مرتبہ: ڈاکٹر فاطمہ حسن، ص ۶۲
۳۵۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بحوالہ رقیہ بانو، ڈاکٹر، ''اردو ناول میں نسوانی کرداروں کا نفسیاتی اور سماجی جائزہ''، ص ۱۶۱
۳۶۔ صالحہ عابد حسین سے ملاقات، خصوصی شمارہ صالحہ عابد حسین نمبر، ماہنامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ص ۶۱